خطبۂ صدارت

(۲۱ اپریل ۱۹۸۰ء)

از

عالی جناب محمد علی خان آف ہوتی

وفاقی وزیر تعلیم

ناشر

اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور

خطبۂ صدارت

عالی جناب محمد علی خان آف ہوتی ، وفاقی وزیر تعلیم

محترم ڈاکٹر باقر صاحب ، ڈاکٹر معزالدین ، مقررین کرام ، خواتین و حضرات !

میرے لیے حضرت علامہ اقبال کی یاد میں منعقد ہونے والے اس جلسے میں شرکت ایک اعزاز ہے جس کے لیے میں اقبال اکیڈمی کا شکر گزار ہوں ۔

اقبال ایک پیامی شاعر تھے اور اُن کا پیغام ابتداً ایک ایسے گروہ کے لیے تھا جو مخصوص تاریخی عوامل کے زیرِ اثر سعی و عمل سے کنارہ کش ہو چکا تھا ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی پسپائی محض ایک سیاسی سانحہ نہ تھا بلکہ اس نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں سے جینے کی اُمنگ چھین لی تھی ۔ اقبال سے پہلے حالی اور اکبر نے بیمار قوم کے مرض کی تشخیص تو کر لی تھی لیکن وہ اس مرض کے اصل سبب کو نہ پہچان سکے ۔ اکبر نے اس کا سبب مذہب سے انحراف بتایا اور حالی نے کہا کہ وہ اجتہادِ فکر اور وسعتِ نظر چھوڑ کر تقدیر پرست اور تنگ خیال بن گئے ہیں ۔ حالی اور اکبر کے علاوہ مولانا شبلی نے بھی اس بات کو محسوس کیا کہ ترقی یافتہ قوموں کے تہذیب و تمدن کو اپنانے اور اُن کی روایات کی پیروی کرنے کی بجائے اگر مسلمان صرف اپنے ہی ماضی کا مطالعہ کریں اور اپنی ہی روایات کا دامن تھامیں اور اس کے ساتھ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیں تو دنیا کی کسی بھی متمدن قوم سے آگے نکل سکتے ہیں ۔ بلکہ شبلی نے تو یہاں تک کہا کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز آگے بڑھنے میں ہے مگر مسلمانوں کی ترقی کا راز پیچھے کی طرف

ملنے میں ہے اور یہی مسلمانوں کے ماضی کے شاندار ہونے کا بین ثبوت ہے۔ علامہ اقبال کو جو بات دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی ابتر حالت کا احساس دلاتے ہوئے کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ ہمیشہ اس بات کا درس دیا کہ زندہ قوموں کو زمانے کے تغیرات اور انقلابات سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ انقلابات ایک فطری عمل ہیں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے ہے
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارہ

مگر زندہ قوموں کو جد و جہد اور عمل سے کبھی منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ یہی اُن کی بڑائی ہے البتہ اگر کوئی قوم اپنے آپ کو عمل سے محروم کر لیتی ہے اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتی تو اُس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مسلسل جد و جہد سے انسان کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینہ میں خودی کا شعلہ روز بروز روشن تر ہوتا جاتا ہے:

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عمل کے لیے لگن کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے اقبال کی اصطلاح میں "عشق" کہتے ہیں۔ عشق سے اقبال کی مراد تخلیقِ ذوق وجدان ہے یہ شدتِ احساس کی ایسی حالت کا نام ہے جو نہایت پُر اسرار طریقے سے انسانی شخصیت کو لازوال بنا دیتی ہے یہی جذبہ انسان کو معراجِ حیات عطا کرتا ہے یہی سوزِ حیات ہے اور یہی سازِ حیات اور رزم گہِ حیات میں اس کی بدولت اعلیٰ مقاصد کا حصول ممکن ہے۔

سامعینِ کرام اقبال کا پیغام ایک حیاتِ تازہ ، پُر جوش ولولے اور امنگ سے بھرپور ہے اور یہ پیغام عصری تقاضوں اور ملت کے افراد کی ظاہری حالت کو بدلنے کے لیے اشد ضروری تھا ۔ علامہ کو پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور دنیا کی آئندہ اُمیدوں کا دارو مدار انھیں پر ہے ۔ اُنھوں نے قوم کو توحید ، اخوت ، عمل اور عشق کا سبق دیا ۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی تکمیل اور فرد و ملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعے ممکن ہے جس میں فرد اور ملت کا تعلق نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید اور رسالت کا ہمہ گیر عقیدہ ہے ۔ فرد کو حقیقی آزادی ملت اسلامی ہی کے اندر حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس ملت نے نوع انسانی کو حقیقی معنوں میں حریت ، مساوات اور اخوت کا عملی نمونہ پیش کیا ۔ ایک ایسی مساوات جو رنگ و نسل ، حسب و نسب اور معاشرتی امتیازات سے بے نیاز ہے ۔

علامہ اقبال کی تاریخ عالم پر گہری نگاہ تھی ۔ وہ اقوام عالم کے عُروج و زوال سے پوری طرح واقف تھے ۔ ان کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کے اجزائے ترکیبی میں ابدیت کے ایسے عناصر موجود ہیں جو اسے کبھی شکست و فنا سے دو چار نہیں ہونے دیں گے ۔ اقبال کے پیغام کی رجائیت کے سوتے اسی احساسِ ابدیت سے پھوٹتے ہیں :

در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست
ملتِ اسلامیـــاں بـود است و ہست

اقبال کی شاعری کا یہ خاص رنگ کسی تعصب ، تنگ نظری یا فرقہ پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ عالم انسانیت کی بقا اور فلاح کے اس خواب سے مربوط ہے جو اقبال زندگی بھر جاگتی آنکھوں سے دیکھتے رہے ۔ ان کے زمانہ کے حوادث و واقعات نے بھی ان کو اس خاص نہج پر سوچنے کے لیے مجبور کیا ۔

اقبال کو اچھی طرح علم تھا کہ کوئی انقلاب اس وقت تک ٹھوس شکل اختیار نہیں کر سکتا جب تک عام انسانوں کے خیالات میں تبدیلی

رونما نہ ہو ۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ملتِ اسلامیہ کو ان خطرات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا جو اسے مغرب کی طرف سے درپیش تھے ۔ ان خطرات میں وطنیت کا وہ محدود اور تنگ و تاریک تصور بھی تھا جو خالصتاً مغربی اذہان کی پیداوار تھا ۔ اور اسلامی نظام فکر اور طرزِ زندگی میں جس کی قطعی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ وہ وطن سے محبت کے قائل تھے تاہم وہ اُس نعرہ کے خلاف تھے جس کی بدولت ایک مختصر سی مدت میں دنیا نے دو عالمی جنگیں دیکھیں نیشنلزم کی تحریک ہمیں انسان دوستی کا سبق نہیں دیتی ۔ اس تحریک نے نہ صرف انسان کو انسان سے جدا کیا بلکہ اسلامی تعلیمات کی سراسر نفی کی ۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے یہ سبق پڑھایا کہ تمام انسان خواہ وہ کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں ، برابر ہیں ۔ اقبال کی دوربین نظروں نے یہ دیکھ لیا کہ مغرب وطن پرستی کا ڈھونگ رچا کر دنیا کو مذہب سے بیگانہ کرکے اور اس طرح ان کی قوت کو پارہ پارہ کرکے مذموم مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسی لیے اُنھوں نے عالمِ اسلام کو تلقین کی :

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی ، نہ ایرانی ، نہ افغانی

علامہؒ اقبال شاعر مشرق بھی ہیں اور شاعر اسلام بھی ، ساتھ ہی ساتھ وہ ہمارے قومی شاعر بھی ہیں ۔ لیکن اگر ہم ان کی شاعری کے پیام کی آفاقی نوعیت پر ذرا بھی غور کریں اور شاعر کے مقصد اور رویے کی وسعت اور جذبات اور احساسات کی گہرائی پر نظر ڈالیں تو اقبال کو شاعر انسانیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ وہ بنی نوعِ انسان کے شاعر ہیں اور تمام نوعِ بشر کو اخوت و محبت کے رشتے میں باندھ کر ایک بہتر اور بلند زندگی اور ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کی طرف لے جانا چاہتے ہیں ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان کو سب سے زیادہ فکر انسان کے مستقبل کی ہے ۔

اقبال نے ہمیں ایک بااختیار اور آزاد انسان کا تصور دیا ۔ ایسا انسان جو مسخر کائنات بھی ہے ۔ یہ نوعِ انسانی کے لیے ان کا ایک اہم عطیہ ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ انسانی زندگی کے لامحدود امکانات کے مبلغ بھی

یہ ان کے تمام فکر کا نصب العین تکمیل آدمیت ہے ۔ دنیا کے ہر ملک کا باسی ان کا مخاطب ہے ۔ وہ فرد میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی استعداد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی شخصیت کو بھرپور بنا سکے ۔

اقبال کے کلام کو پڑھ کر قاری اپنے اندر ایک نیا ولولۂ حیات اور اپنے ذہن میں ایک نئی روشنی محسوس کرتا ہے :

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

• • • •

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

علامہ اقبال نے ایک ماہر اور نباض حکیم کی طرح ان اسباب کو بھی سمجھا جو مغرب کے زیرِ اثر عالم اسلام کے بدن میں زہر گھول رہے تھے اور فسادِ فکر و نظر پیدا کرنے کا ذریعہ تھے ۔ مغرب کی تمام تر ترقی مشاہدہ اور تجربات سے اخذ شدہ نتائج پر مبنی تھی ۔ یوں نوجوانوں کے دماغ تو روشن ہوئے مگر ان کے دل تیرہ و تاریک ہو کر رہ گئے ۔

اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں نئی نسل کو مخاطب کرکے جو نصیحت کی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ دانش کی دو قسمیں ہیں ایک دانشِ نورانی اور دوسری دانش برہانی ۔ دانشِ برہانی سے بجز حیرت و تشنگی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ۔ ہمیں فلسفیوں کے نکتہ دقیق پر ایمان و یقین کو ترجیح دینی چاہیے اور قلب کی گہرائیوں سے خالق بزرگ و برتر کی عظمت اور محمدؐ عربی کی رسالت کا اقرار کرنا چاہیے ۔ آدمی اپنی بندگی اور عبودیت کا رشتہ اسی ذاتِ برحق سے جوڑے اور تمام عالم سے بے نیاز ہو جائے جس طرح توحید جب قلب کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے تو عشق پیدا ہوتا ہے جو سراپا یقین اور سراپا حضورؐ ہے ۔ آتشِ عشق قلب کی ظلمتوں کو نور سے بدل دیتی ہے ۔ موت جیسی شے اب اس کا محبوب قرار پاتی ہے اور جس کے دل میں موت کی محبت سرایت کر جائے

اس میں دنیا کے مال و جاہ کی محبت کیسے غالب آ سکتی ہے اور یوں بندہ میں 'فقر' پیدا ہو جاتا ہے ۔

علامہ اقبال نے جن خطرات کو محسوس کیا تھا ، دنیائے اسلام کو آج بھی ان کا سامنا ہے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم حضرت علامہ کی تعلیمات کی روشنی میں عہدِ جدید کے امراض کو پہچانیں اور ان کا علاج بھی دریافت کریں ۔ آج عالمِ اسلام ایک اضطراب سے دوچار ہے یہ بے چینی ایک نئی زندگی کی علامت ہے ۔ مگر اس وقت صحیح سمت کا تعین از بس ضروری ہے اگر ہمارے دلوں میں ایمان اور یقین کی لو بلند ہو تو راستے کے مصائب جو بظاہر پہاڑ کی طرح دکھائی دیتے ہیں پرِ کاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ۔

● ● ●